پاکستان اور امریکی دستور

ایک علمی مطالعہ و تجزیہ

نعیم صدیقی

ہمارے ہاں گذشتہ آٹھ دس مہینے کے بحرانی دور میں امریکی دستور کا تذکرہ بار بار عجیب انداز سے چھڑا ہے۔ اچانک ایوانِ اقتدار سے یہ آواز عوام کو سنائی دی کہ برطانوی انداز کے دستوری ڈھانچے کو چھوڑ کر ہم امریکی طرز کا ڈھانچہ اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ تاریخ اور سیاست اور دستوریات کے طالب علموں کے دل میں یہ بولی سنتے ہی قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوا کہ آخر ملک کے دستوری رجحانات میں کونسا تغیر و تبدل ایسا رونما ہو گیا ہے کہ جس کا ردِ عمل یوں ظاہر ہو رہا ہے۔ کیا علمائے دین و سیاست کہیں سر جوڑ کر بیٹھے اور انہوں نے غور و فکر کے بعد یہ رہنمائی دی ہے؟ کیا عام لوگوں کی طرف سے کوئی ایجی ٹیشن ہوا ہے؟ کیا سیاسی پارٹیوں نے اس طرح کا کوئی مطالبہ کیا ہے؟ کیا اخباروں کے کالموں میں اس موضوع پر کوئی بحث چھڑ کر کسی ایسے نتیجے پر پہنچ گئی ہے؟ آخر وہ محرک کیا ہے جو اس بولی کے پیچھے کام کر رہا ہے؟ پھر سوچنے والے یہ بھی سوچتے ہیں کہ کیا ہماری ملی آئیڈیالوجی یا ہماری پچھلی سیاسی تاریخ میں کوئی ایسا تقاضا دبا پڑا تھا جو ہمیں برطانوی دستوری ڈھانچے سے ہٹا کر امریکی ڈھانچے کی طرف لے جانے کے لیے زور کر رہا ہو اور اب یکایک اپنے لیے سازگار فضا پا کر پھوٹ آیا ہو اور دیکھتے دیکھتے ایک تناور درخت کی صورت اختیار کر گیا ہو۔ پھر ایک معمّا یہ بھی حل طلب قرار پاتا ہے کہ امریکی دستور کم سے کم مغربی تصورِ جمہوریت کے لحاظ سے دنیا بھر میں معیاری حیثیت رکھتا ہے، اور اس کی طرف اگر نگاہِ تقلید اٹھ سکتی ہے تو صرف ایسے لوگوں کی اٹھ سکتی ہے جو مغربی طرز کی معیاری جمہوریت کی نیو ڈالنا چاہتے ہوں اور حکمرانی کے اختیار کا اصل سرچشمہ عوام کو قرار دے کر اپنے مقابلے میں ان کو پورے پورے جمہوری حقوق سے آراستہ کرنا چاہتے ہوں اور اپنے مستبدانہ اختیارات

سے ملکی فلاح و بہبود کے لیے دست بردار ہونا چاہتے ہوں۔ پھر آخر کیا وجہ ہے کہ پاکستان کی سرزمین عجائبات میں امریکی دستوری ڈھانچے کی طرف نگاہ اُٹھی بھی تو ایسے لوگوں کی اُٹھی جو قوم کے مقابلے میں نہ صرف یہ کہ غیر محدود اندھے اختیارات سے مسلح ہیں اور ان میں نت نئے اضافے کرنے کے درپے ہیں، بلکہ اپنی ٹیم کے حلقے میں اختیارات کی تقسیم ہی کے لیے ایک غیر مختتم سازشی جہاد بپا کیے ہوئے ہیں اور جن کا حال یہ ہے کہ اپنی اسی اقتدار طلبی کی کشمکش پر انہوں نے ملک کی رہی سہی برائے نام جمہوریت کو بھی پہلا موقع پاتے ہی بھینٹ چڑھا کر آمریت کی ایک خوفناک فضا پیدا کر دی۔ عین اسی خود پیدا کردہ فضا میں صدا بلند کی جاتی ہے کہ ہم برطانوی طرز کے دستوری ڈھانچے کو چھوڑ کر امریکی ڈھانچہ اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ اس میں کوئی راز ہے اور بڑا اہم راز ہے۔ آیئے اسے کھود نکالیں۔

یاد کیجیے اس واقعہ کو کہ ہمارے ہاں جو سیاسی بحران ۲۴ اکتوبر ۱۹۵۴ء کو نمودار ہوا تھا اس کے پس منظر میں یہ واقعات کارفرما تھے:

پروڈا نامی قانون، جو گورنر جنرل کو وزارت کے خلاف ایک خصوصی اختیار کے مضبوط لٹھ سے مسلح کیے ہوئے تھا، مرکزی پارلیمنٹ میں اس کی منسوخی کا بل پاس ہوتا ہے لیکن سابق میں جو افراد اس قانون کے تحت کسی تادیبی کارروائی کی زد میں آ چکے تھے ان کو یہ بل ان کے حال پر چھوڑ دیتا ہے۔ اس تبدیلی سے گورنر جنرل اور وزارت کا سابق توازن قوت بالکل متزلزل ہو گیا۔ یہ چیز گورنر جنرل کی خوشنودی کے بالکل خلاف تھی۔ چنانچہ اور تو کچھ نہ ہو سکا، گورنر جنرل نے معافی کے خاص اختیارات سے کام لے کر میاں ممتاز محمد خان دولتانہ (پنجاب) اور محمد ایوب کھوڑو (سندھ) کو پروڈا کی تادیبی کارروائی کی زد سے باہر نکال لیا۔

وزارت نے مزید ممکن اقدامات کو سامنے رکھتے ہوئے اپنے کو نئے خطرے میں محسوس کیا تو ایک قدم اور آگے بڑھا دیا۔ اس نے دستور میں ترمیم کر کے گورنر جنرل کے تمام خصوصی اختیارات سلب کر لیے اور اسے محض دستوری سربراہ کی حیثیت دے دی۔ اس اقدام سے اقتدار کا توازن بالکل بنیادی طور پر بدل گیا۔ یہ دو حادثے اگر رونما نہ ہوتے تو شاید سرے سے وہ بحرانی دور ہی شروع نہ ہوتا جس سے گزرتے ہوئے ہم نے بہت کچھ کھویا ہے۔ اس کے چند ہی روز بعد دستور ساز اسمبلی کو توڑنے کا اعلان ہو جاتا ہے اور جبر

یہ آواز اٹھتی ہے کہ پاکستان کا آئندہ دستور امریکی ڈھانچے پر بنے گا اور اس کی تسوید ہو رہی ہے۔ درحقیقت امریکی ڈھانچے میں جس چیز کو دیکھ کر بعض حضرات کی رال ٹپکی وہ صدر کے اختیارات اور اس کی مضبوط دستوری حیثیت ہے۔ اس دستور میں ہمارے بزرگوں کو سرے سے اور کوئی جاذب توجہ چیز ملی ہی نہیں۔ اس میں واحد قابل قدر جوہر انہیں صرف یہ دکھائی دیا ہے کہ صدارت کا تخت جب ہم کبھا کر بیٹھیں گے تو ہمارے ہاتھوں میں بڑی بھاری طاقت ہوگی اور ہمارے قبضے میں بڑے وسیع اختیارات ہونگے۔ برطانوی نظام دستور میں سربراہ مملکت بے بس ہوتا ہے لیکن امریکی نظام میں طاقت کا ایک بڑا حصہ مقننہ کے مقابلے میں اس کو دیا جاتا ہے۔ ہمارے بزرگ امریکی صدر کی سی طاقت تو حاصل کر لینا چاہتے ہیں مگر اس کے جواب میں عوام کو وہ کچھ دینے پر تیار نہیں ہیں جو امریکی دستور اپنے عوام کو دیتا ہے۔ عوام کے حقوق کا سوال آئے تو یہ فوراً کہیں گے کہ ہمارے عوام، جاہل، بدھو، نالائق اور نااہل ہیں۔ ان کو امریکی اور برطانوی طرز کی جمہوریت نہیں دی جا سکتی، ان کو صرف کنٹرول کی ہوئی اور راشن کی ہوئی جمہوریت ملے گی۔

اسلامی نقطہ نظر سے ہمارے سامنے امر واقعہ یہ ہے کہ ایک مسلمان قوم اپنے نظام فکر و تہذیب کے مطابق خود مختارانہ زندگی بسر کرنے کے لیے ایک لمبی جد و جہد کرتی ہوئی پاکستان کو حاصل کر چکی ہے اور اب وہ اس امر کے لیے بے چین ہے کہ اس کی دیرینہ ملی تمناؤں کے مطابق ایک اسلامی ریاست تشکیل پذیر ہو۔ وہ اپنی ریاست کو اپنی مخصوص آئیڈیالوجی پر استوار کرنا چاہتی ہے۔ دستور کے اصولیات اور اس کے ڈھانچے کے بارے میں جب بھی سوچا جائیگا تو سب سے پہلے یہی آئیڈیالوجی زیر غور آئیگی کہ اس کے تقاضے کیا ہیں۔ بغیر تفصیل میں جانے ہم یہ رائے رکھتے ہیں کہ ہماری آئیڈیالوجی جہاں ہمیں دستوری اصولیات دیتی ہے وہاں وہ ان اصولوں کے اندر سے اپنا ایک علاحدہ اور مستقل نوعیت کا دستوری ڈھانچہ بھی برآمد کر سکتی ہے۔ اس آئیڈیالوجی کے تحت ایک معیاری اسلامی دستور کے بننے اور چلنے کا موقع جب پیدا ہوگا تو دنیا کے سامنے ایک نیا دستوری ڈھانچہ اسی طرح رونما ہو جائیگا جس طرح امریکہ اور روس نے اپنے اپنے ملی اور تہذیبی حالات کے مطابق آزادانہ ذہن سے کام لے کر نئے ڈھانچے پیدا کر دکھائے ہیں۔ لیکن دور حاضر کی ضروریات کے لحاظ سے نمونے کے معیاری اسلامی دستور تک

پہنچنے سے پہلے ہمیں ایک ایسا عبوری مرحلہ طے کرنا ہے جس میں نظریۂ اسلامی سے ماخوذ دستوری اصولوں کو کسی ایسے ڈھانچے کے ساتھ نافذ کر دیا جائے جس کو قبول کرنے اور چلانے پر آسانی سے ذہنی اشتراک پیدا کیا جا سکے۔ اس عبوری مرحلے کی ضرورت کے لحاظ سے اصولاً اسلام کی آئیڈیالوجی اور اس کے دستوری اصول اور تقاضے برطانوی یا امریکی کسی بھی ڈھانچے کے اندر یکساں کارفرما ہو سکتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں اسلامی نقطۂ نظر سے ہم ان ڈھانچوں میں کسی ایک کے لیے کوئی تعصب آمیز حمایت رکھتے ہیں، نہ مخالفت! البتہ یہ ضرور کہتے ہیں کہ دونوں میں سے جس کو بھی لیا جائے اسے اس کے تمام ضروری عناصر ترکیبی کے ساتھ لیا جائے اور ایسا نہ ہو کہ دونوں کی خوبیوں کو ضائع کر کے دونوں کی برائیوں کو جمع کر لیا جائے۔ نیز یہ بھی کہتے ہیں کہ برطانوی ڈھانچے پہ کام کرنے کے مقابلے میں امریکی ڈھانچے پر کام کرنے کی صورت میں جو مشکلات سامنے آتی ہیں ان کو پہلے سوچ لیا جائے۔ اور یہ مسئلہ چند شخصیتوں کے سوچنے کا نہیں، پوری قوم کے غور و فکر کا محتاج ہے۔ ہم ضرورت محسوس کرتے ہیں کہ ایک بار امریکی دستور کی ماہیت کو تعلیم یافتہ عوام بالخصوص دستور ساز حضرات کے سامنے واضح کر دیں۔

امریکی دستور کا ذہنی اور تاریخی پس منظر | کسی قوم کا دستور خارج سے درآمد کر کے اس کے اوپر اوڑھا دینے کی چیز نہیں ہوتا کہ جب جہاں سے چاہا ایک دستور یا اس کا کوئی جزو لے لیا اور جب جی بھر چاہا اسے پرے پھینک کر کوئی دوسرا کسی اور بازار سے منگا لیا۔ دستور ایک قوم کے نفسیاتی، اعتقادی، معاشی، معاشرتی اور تاریخی عوامل کی ضرورتوں اور تقاضوں سے ترکیب پاتا ہے۔ اس کی بڑی گہری جڑیں ہوتی ہیں۔ اس کے بڑے عوائق و علائق ہوتے ہیں۔ اس کے پس منظر میں بڑی موثر طاقتیں کام کر رہی ہوتی ہیں۔ اسی اصول پر اگر آپ امریکی دستور کا مطالعہ کرنا چاہیں تو آپ کو اس کے تاریخی اور سیاسی و تہذیبی پس منظر کا جائزہ لینا ہو گا۔

"تاریخ و سیاست کا متوسط مطالعہ رکھنے والا بھی یہ جانتا ہے کہ انقلاب امریکہ درحقیقت انقلاب انگلستان کا پہلوٹھا بچہ تھا۔ یہ درحقیقت ان برطانویوں کے اخلاف کا کارنامہ ہے جنہوں نے چارلس اول کے "خدائی حقوق" کے خلاف معرکہ لڑ کر نمائندہ پارلیمنٹ کے ذریعے حکومت خود اختیاری کی سمت میں ایک تاریخ افروز قدم اٹھایا۔ یہ اٹھارویں صدی جس کے اختتام پر امریکی انقلاب ظہور میں آیا ایک ایسے دور پر مشتمل تھی جس میں یورپ

کی سرزمین پر سابق مذہبی بنیادوں سے ہٹ کر قومی اور نسلی اساس پر حکومتوں اور معاشروں کی اٹھان ہو رہی تھی۔ سوداگروں کے سرمایوں اور تجارتی کمپنیوں کے بحری بیڑوں کی طاقت حکمرانوں کی پشت پر تھی اور اس طاقت کے بل پر وہ ایشیا، افریقہ اور امریکہ میں نوآبادیاں پیدا کرنے کی کشمکش میں لگ گئے۔

ہسپانیہ اور پرتگال ایک صدی پہلے سے بحر ہند اور بحر الکاہل کو چھان رہے تھے کہ یکایک ہالینڈ اور انگلستان بیچ میں آ کودے۔ عجیب اتفاق کہ بعد میں آنے والے پہلوں کے مقابلے میں فائدہ میں رہے اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ ہسپانویوں اور پرتگالیوں نے بڑی حد تک ابتدائی مشکل کام سرانجام دے لیے تھے اور ہالینڈ اور انگلستان کو کامیابی کے راستے بنے بنائے مل گئے۔ دوسری وجہ یہ ہوئی کہ اول الذکر طاقتیں مقامی آبادیوں کے مقابلے میں انتہائی ظالمانہ رویہ رکھنے کی وجہ سے ان کی نگاہوں میں سخت مردود ہو چکی تھیں بعد میں جب موخر الذکر دو طاقتیں ان کی حریف بن کر میدان میں اتریں تو مقامی آبادیوں نے ان کو اپنا نجات دہندہ سمجھا اور انہوں نے پچھلی تجربوں کی روشنی میں اپنے خطوط روابط زیادہ بہتر موقع پر کھینچے۔ یہ لوگ مقامی آبادیوں کو فراخ دلی سے زندہ رہنے کا حق دینے کو تیار تھے بشرطیکہ ان کو سونا چاندی، ٹیکس، غلام اور سستی بلکہ مفت کی محنت نوآبادیاتی حلقوں سے حاصل ہوتی رہے۔

لیکن کئی شکاریوں کا شکارگاہوں میں بیک دم کود پڑنا ان کے درمیان باہمی تصادم و کشمکش کا محرک ہوا۔ ادھر تو تصادم شکارگاہوں کے اندر برسر موقع پورے تسلسل سے ہو رہا تھا، اُدھر یہ مشکل کہ اس کا اصل فیصلہ نوآبادکاروں کی وطنی حکومتوں کے درمیان کئی ہزار میل کی دوری پر ہوتا تھا۔ یہ دور وہ ہے جس میں کسی حکومت کی اصل طاقت بحری طاقت تھی اور تاریخی حقیقت یہ تسلیم کی جاتی تھی کہ "جس کا سمندر ہے اسی کا ساحل بھی ہے" چنانچہ انگلستان اور ہالینڈ کے درمیان بحری جنگوں کا سلسلہ کئی برس جاری رہا جس کی تفصیل یہاں دینا غیر ضروری ہے۔ البتہ فرانس اور انگلستان کے درمیان جو معرکہ آرائی ہوئی اور جس کا فیصلہ امریکہ ہی کی سرزمین پر انگلستان کے حق میں ہوا وہ ہمارے موضوع سے زیادہ قریبی تعلق رکھتی ہے اس لیے اس کے بارے میں چند سطریں لکھے بغیر چارہ نہیں

امریکہ کی دریافت کے بعد یورپ کے بادشاہوں اور تاجروں کے لیے اولاً جو چیز جاذب توجہ ہوئی وہ سونے چاندی کی کانیں تھیں۔ لیکن آگے چل کر اس سرزمین کی سونا اگل سکنے والی کنواری مٹی، اس کے ان چھوٹے

قدرتی ذرائع و وسائل، نو آباد کاروں کو اپنی کھلی ہوئی گود کی طرف دعوت دینے والے وسیع علاقے بھی اہلِ عزم و ہمت کو اپنی طرف کھینچنے لگے۔ یورپ کے لیے جیسے ایک جہانِ نو کے دروازے کھل گئے۔ ۱۴۹۷ء کا واقعہ ہے کہ کیبٹ (CABOT) نے برطانوی جھنڈا انہیں لیے امریکہ کے شمالی حصے میں قدم رکھا اور اس جھنڈے نے کہا کہ پورا امریکہ برطانیہ کی ملکیت ہے ۲۷ برس بعد جیووینی دیرازینو فرانسیسی جھنڈا لہراتا آ پہنچا اور اس نے فرانس کے لیے اس دعوے کا موقع پیدا کیا کہ امریکہ ہمارا ہے۔

برطانوی اور فرانسیسی نو آباد کاروں میں ایک بنیادی فرق تھا جس کا اثر خود انقلابِ امریکہ کے پیچھے کام کرنے والا تھا۔ برطانیہ سے مجرموں اور باغیوں کے علاوہ زیادہ تر جو لوگ امریکہ آئے وہ ایسے لوگ تھے جو اپنے مذہبی تصورات کے ساتھ اپنے وطن میں سکھ چین نہ پا سکنے اور سیاسی استبداد کا شکار ہونے کی وجہ سے یہاں ہجرت کر کے چلے آ رہے تھے۔ مثلاً پیورٹن تھے جن کی ایک بڑی تعداد ۱۶۲۰ء میں نیوزی لینڈ کو منتقل ہوئی۔ اور (QUAKERS)[1] تھے جو ۱۶۸۱ء میں پنسلوانیا میں آ ٹکے۔ سیاسی اور مذہبی اور سماجی وجوہ سے جن لوگوں کے لیے انگلستان میں سکون کی زندگی کا امکان نہ رہا، انہوں نے امریکہ کی آزاد فضاؤں کا رُخ کیا۔ ایسے عناصر بادشاہی اقتدار کا بوجھ گردن سے اتار کر ایک نئی آزاد اور خوش و خرم زندگی کی نیو ڈالنا چاہتے تھے۔ یاد رہے کہ ان کے ذہنوں میں انگلستان کی سترھویں صدی کی سیاسی کشمکش کا پورا ماحول رچا بسا ہُوا تھا اور انقلابِ انگلستان کے فکری بیج یہ اپنی جھولیوں میں لیے چلے تھے۔

دوسری طرف فرانسیسی نو آبادکاروں کی سیاسی ساخت بالکل دوسری تھی۔ یہ لوگ ایک بادشاہی اقتدار کی وفادار رعایا بلکہ اس کے ملازم ہونے کی حیثیت سے میدان میں اترے تھے اور انہوں نے نو آبادیاتی مہم تاج کے زیرِ فرمان شروع کی تھی۔ مذہبی انحراف پسندوں مثلاً (HUGUENOTS)[2] اور پروٹسٹنٹوں پر انہوں نے نو آبادیات کے دروازے بند رکھے۔ کیونکہ ان کو اندیشہ یہ تھا کہ یہ عناصر اپنے باغیانہ خیالات پھیلا کر مقامی آبادی کا ذہن خراب کر دیں گے اور یسوعی پادریوں کی تبلیغ کے لیے میدان تنگ ہو جائے گا۔

برطانوی لوگ امریکہ میں منتقلاً بس جانے کے لیے آئے تھے، لیکن فرانسیسی صرف ادائے فرض کے لیے

---

[1] یہ ایک انحراف پسند گروہ سے تعلق رکھنے والوں کا اصطلاحی نام ہے۔ انہوں نے اپنے آپ کو (SOCIETY OF FRIENDS) کے نام سے موسوم کیا تھا۔

[2] سولھویں صدی کی مذہبی جنگوں کے فرانسیسی دَور کا پیدا کردہ فرانسیسی پروٹسٹنٹ گروہ۔

آئے تھے اور اولیں موقع ملتے ہی وطن واپس لوٹنے کے آرزومند تھے!

برطانوی فرامینِ عطا کی رُو سے نو آبادکار کمپنیوں کو ایک ساحل سے دوسرے ساحل تک کا پورا علاقہ بالعموم حاصل ہوتا تھا لیکن ایک صدی کے اندر فرانسیسیوں نے ۶۰ قلعہ بندیوں کی لائن قائم کرکے سرزمین واقعہ پر برطانوی نو آبادیوں کا سمندر سے رابطہ توڑ دیا۔ اس لیے عملاً برطانوی حدود ان قلعہ بندیوں کی لائن پر آکر ختم ہو جاتی تھیں۔ ایک طرف اس آہنی خط کو قائم رکھنے اور دوسری طرف سے اسے توڑ دینے کے لیے کشمکش کا جو دور گذرا ہے اس نے دونوں طرف سے جان و مال کی بڑی بھاری بھینٹ لی۔

اسٹوارٹ خاندان کے دور میں برطانیہ اور فرانس کی باہمی جنگ کا کوئی امکان نہ تھا لیکن ۱۶۸۹ء میں جب اس خاندان کا نام و نشان تک انگلستان میں نہ رہا اور ڈچ ولیم تخت نشین ہوا تو فریقین کے درمیان شمالی امریکہ کے مقبوضات کے لیے تصادم شروع ہو گیا۔ یہ تصادم معاہدہ پیرس ۱۷۶۳ء کے ذریعے ختم ہوا اور اب پورا شمالی امریکہ برطانوی تسلط میں آگیا۔

برطانوی لوگ جو تیرہ نو آبادیوں میں بس رہے تھے فرانس کو شکست دینے کے بعد ذہنی لحاظ سے اپنے آپ کو تاجِ انگلستان کی سرپرستی سے بے نیاز محسوس کرنے لگے۔ علاوہ بریں امریکہ کی آزاد ہواؤں میں سانس لینے اور کھلے آسمان کے نیچے جولانیاں دکھانے کی وجہ سے ان کے دلوں میں آزادی کی ہوا بھرنے لگی۔ یہ گویا اپنے آپ بادشاہ تھے۔ یہ لوگ سرگرم اور جفاکش بھی تھے، ورنہ سمندر پار کرکے اتنی دور آتے ہی کیونکر! ترکِ وطن اور تعمیرِ نو اور جنگ و جدل نے ان کے عزم و ہمت میں روز افزوں اضافہ کر دیا۔ اب یہ لوگ تاج برطانیہ کے زیرنگیں رہنے کے لیے موزوں نہیں رہے تھے، لیکن برطانوی حکومت ان کو اول روز سے اپنا محکوم سمجھتی تھی۔ اور ان کے آزادی پسندانہ رجحانات اسے کبھی پسند نہیں آسکتے تھے۔ یہ دو متضاد رجحانات تھے جو ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہوتے جا رہے تھے۔ تاریخ کا ایک مستقل معمول یہ ہے کہ جب کبھی دو متضاد رجحانات آمنے سامنے آجاتے ہیں تو پھر وہ انتہا پسندی کی طرف ارتقا کرتے ہیں، یہاں تک کہ ان میں فیصلہ کن ٹکر ہو جاتی ہے اور پھر ایک رجحان دوسرے کو چت کرکے چھوڑتا ہے۔ تاریخ کا یہی معمول ہر انقلاب میں کام کرتا ہے۔ یہاں بھی اسی تاریخی معمول نے اپنا کرشمہ دکھایا! برطانوی حکومت نو آبادکاروں کے لیے اور نو آبادکار برطانوی حکومت

کے لیے پریشانی کے اسباب پیدا کرنے لگے۔ بدگمانیاں اُبھریں اور ہر بدگمانی مزید بدگمانی پیدا کرتی چلی گئی۔ اس ذہنی اُلجھاؤ کو باقاعدہ سیاسی کشمکش میں بدلنے میں سب سے بڑا پارٹ حکومتِ انگلستان کی تجارتی پالیسی کا ہے۔ حکومت جس کے پیچھے ایک سوداگرانہ نظام کام کر رہا تھا، اس امر کے درپے تھی کہ انگلستان کے تجارتی مفاد کو محفوظ کیا جائے چنانچہ تجارتی قانون سازی اور محصولات کے عائد کرنے میں نوآبادیات کے مفاد کو انگلستان کے مفاد پر بھینٹ چڑھایا جانے لگا۔ مثلاً ۱۷۶۵ء میں قانونِ دستاویزات (...amps Act) پاس کیا گیا جس کا تقاضا یہ تھا کہ نوآبادیات کی تمام رسمی و قانونی دستاویزات لازماً برطانوی اسٹامپ پر لکھی جائیں۔ ڈیوٹی کی رقم برطانوی خزانے میں داخل ہو اور یہ کہ ٹیکس لگانے کا پورا پورا اختیار پارلیمنٹ کو حاصل ہو۔ علاوہ بریں ساتھ ہی یہ بھی قرار پایا کہ امریکی سرزمین پر برطانیہ کی طرف سے ایک مستقل فوج انحراف اور بغاوت کو روکنے کے لیے رکھی جائے جس کے خرچ کا ایک حصہ خود نوآبادیات ادا کریں۔ اس پر برطانوی نوآبادکاروں کے اندر اندر کھولنے والے جذبات کا لاوہ پھٹ کر نکلا۔ ایک ہمہ گیر صدائے احتجاج بلند ہوئی جو نظریاتی رنگ پا کر اس نعرے میں ڈھلی کہ حکومت کا ٹیکس عائد کرنے کا اختیار اور عوام کا نمائندگی کا حق باہم دگر لازم ملزوم ہیں۔ جس حکومت اور پارلیمنٹ میں ہماری نمائندگی نہیں، جس کے لیے ہم ووٹ نہیں دے سکتے اور جس کے اندر ہماری آواز نہیں، اسے ہم پر ٹیکس لگانے کا حق بھی حاصل نہیں۔ برطانوی حکومت نے اس کے جواب میں "قانونِ دستاویزات" سے ایک قدم پیچھے ہٹاتے ہوئے ایک اور قانون ...atory Act کے نام سے پاس کیا جس میں پارلیمنٹ کے بنائے ہوئے قوانین کو نوآبادیات کے لیے واجب النفاذ قرار دیا گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ انگلستان سے امریکہ میں درآمد ہونے والی بعض اشیاء مثلاً شیشے، رنگوں، کاغذ اور چائے پر نئے درآمدی ٹیکس عائد کیے گئے۔ اس احمقانہ اقدام نے بوسٹن کے ساحلی مقام پر بغاوت پیدا کر دی (۱۷۷۰ء) اور برطانوی حکومت کی طرف سے ہجوم پر گولی چلائی گئی۔ نتیجہ کے طور پر ایک بھاری ذہنی طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ اس طوفان کو فرو کرنے کے لیے برطانیہ نے پہلے تو ٹیکس کی مقدار میں کمی کی، پھر بجز چائے کے اور ساری چیزوں سے ٹیکس ہٹا دیا۔ برطانوی وزارت بات کی تہ کو نہ پہنچ سکی کہ معاملہ اب اصولی و نظریاتی معیار پر آ گیا ہے، اس نے سارے طوفان کو ٹیکس کی زیادتی کے خلاف وقتی شکایت کا ظہور سمجھا۔

اِدھر نوآبادیوں میں یہ احساس عام ہو گیا کہ امن پسندانہ دلائل سے کام نہیں چلے گا۔ چنانچہ انہوں نے ہتھیار اٹھانے کا تہیہ کر لیا۔ جذباتِ کشمکش کا بارود خانہ دوسری مرتبہ اس وقت بھک سے اُڑا جب محصول زدہ چائے کے جہازوں کا بیڑہ امریکہ کے ساحل سے جا کر لگا۔ مشتعل ہجوم نے جہازوں میں گھس کر درآمد شدہ چائے کی ساری مقدار تباہ کر ڈالی۔ برطانوی حکومت اس باغیانہ اقدام پر فوج کشی کیے بغیر کیسے رہ سکتی تھی۔ اب وہ تصادم باقاعدہ شروع ہو گیا جو امریکی جنگِ آزادی کے نام سے مشہور ہے۔ یہ تصادم سات برس تک جاری رہا اور نوآبادکاروں کی قسمت اس دوران میں ہمیشہ ڈانواں ڈول رہی۔ لیکن یکایک واشنگٹن کی شخصیت اُبھری جو فرانسیسی طاقت کو شکست دینے میں نمایاں پارٹ ادا کر چکا تھا۔ جنگِ آزادی کی کمان جب اس شخص کے مضبوط ہاتھوں میں چلی گئی تو قسمت نے یاوری کی۔ ۱۷۷۸ء میں فرانس نے برطانیہ کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ ۱۷۷۹ء میں ہسپانیہ کے چارلس سوم نے بھی فرانس کی تقلید کی اور ۱۷۸۰ء میں ہالینڈ بھی برطانیہ کے خلاف کود پڑا۔ یورپ کی ان طاقتوں نے واشنگٹن کے ہاتھ مضبوط کرنے میں بھی خاصہ حصہ لیا۔ یہاں تک کہ ۱۹ اکتوبر ۱۷۸۱ء کو برطانیہ کی طاقت نے آخری شکست کھائی اور آزاد امریکہ وجود پذیر ہوا۔

نوآبادیوں میں سیاسی اور مذہبی کسی لحاظ سے بھی کوئی ایسی وحدت موجود نہ تھی جو ان کو متحدہ طاقت میں بدل سکتی۔ بس انگلستان کی فوج کشی کے ردِ عمل نے اور جنگی ضرورت نے ان کو اس لاعلاج انتشار سے نکال کر اتحاد و ائتلاف کی طرف مائل کیا جو ان میں شروع سے کارفرما تھا۔ ریاستوں کے نمائندوں کا پہلا اجتماع مشترک مسائل پر غور کرنے کے لیے فلاڈلفیا میں جمع ہوا۔ یہیں سے درحقیقت اس وفاقی کانگریس کی نیو پڑتی ہے جو آج امریکی طاقت کی عناں بردار ہے۔ جون جولائی (۱۷۷۶ء) میں ریاستوں کے نمائندوں کی ایک تاریخی کانفرنس نے وہ یادگاری فیصلے کیے جو صرف اہلِ عزیمت ہی سے متوقع ہو سکتے ہیں۔ اس مجلس نے امریکہ کے بالاترین سیاسی اقتدار کا مقام لے لیا اور فوجی اور جنگی طاقت کی باگ ڈور تھام لی!

(باقی)